مسلمانوں کا مسئلہ

ہم مسلمان کم و بیش ایک ہزار سال تک عالم کی مسند اقتدار پر فائز رہنے کے بعد معزول ہو چکے ہیں۔ یہ واقعہ رونما ہوئے تین چار صدیاں بیت گئی ہیں۔ قوموں کی زندگی میں یہ عرصہ نشاۃ ثانیہ کے لیے تو کافی نہیں ہوتا، مگر اس امر کے لیے بہت کافی ہوتا ہے کہ کوئی قوم زوال کے اسباب متعین کر کے ان کے تدارک کے لیے سرگرم ہو جائے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اسباب زوال کا تعین تو کجا، ابھی تک اپنی معزولی کے بارے میں قدرت کا فیصلہ ہی نہیں جان سکے۔ دنیا کی محکوم محض قوم ہونے کے باوجود ہم تسلط و اقتدار کی نفسیات میں جی رہے ہیں۔ گویا ایوان عالم میں پابند سلاسل کھڑے ہیں اور تسخیر کائنات کا اعلان کر رہے ہیں۔ ایک عظیم داستان سفاہت ہے جو ہم نے گزشتہ دو صدیوں میں رقم کی ہے۔ یہ داستان کسی خاص خطے یا نسل سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ جہاں جہاں ہماری اجتماعیت موجود ہے، اس کے ابواب بکھرے پڑے ہیں۔ افغانستان کی جنگ اسی داستان کا ایک الم انگیز باب ہے۔ اسے پڑھ کر اہل دنیا حیران ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں جو اجتماعی اخلاقیات میں تنزل کے آخری مقام پر کھڑے ہیں اور اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ دنیا اخلاق کا درس ان سے سیکھے۔ جدید علوم و فنون کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں اور تمنا ہے کہ ان کی ہر بات مستند سمجھی جائے۔ معمولی دفاع کی صلاحیت سے محروم ہیں، مگر دنیا پر چڑھ دوڑنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ اپنے پروردگار سے بے گانہ ہیں اور پھر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت و رحمت انھی کے لیے خاص ہے۔

ہم مسلمانوں کی یہ حالت لائق صد افسوس ہے، مگر ماتم اس بات کا ہے کہ مسلمان قوم کو اس مرض میں مبتلا کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھیں منصب مسیحائی حاصل ہے۔ ان کی اس مسیحائی کا نظارہ مسجدوں کے منبروں اور مذہبی جلسوں کے اسٹیجوں پر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں سے انقلاب، جہاد اور تباہ کر دو، برباد کر دو، جلا کر راکھ بنا دو اور جان سے مار ڈالو کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام کا ہدفِ اصلی دنیا پر غلبہ اور حکمرانی قائم کرنا ہے، اس لیے ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لیے پوری جدوجہد کرے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ مقدمہ بجائے خود صحیح بھی ہے یا نہیں، ان علم بردارانِ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انقلاب کا طرزِعمل اپنے مقاصد ہی کے منافی ہے۔ اس ہدف کی طرف بڑھنے کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ایک جانب اپنے اخلاق و کردار کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اقوامِ عالم کی نظریں ان کی جانب اٹھنی شروع ہو جائیں اور دوسری طرف دورِ جدید کے اسلحہ سے اپنے آپ کو لیس کیا جائے اور اس امر واقعی کا ادراک کر لیا جائے کہ دورِ حاضر کے اسلحہ تیر و تفنگ اور گولا بارود نہیں، بلکہ علم و ہنر اور اقتصادی وسائل ہیں۔

اس تناظر میں اگر ہم اپنے وجود اجتماعی کا جائزہ لیں تو چند در چند مسائل کی ایک فہرست رقم کی جا سکتی ہے، مگر ان کے لیے جامع ترین الفاظ جہالت اور غربت ہیں۔ یہ امراض ہمارے پورے وجود میں ناسور کی طرح سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے اخلاق و کردار، تعلیم و تعلم اور نظم و اجتماع میں اس کے مظاہر بالکل نمایاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اخلاق و کردار کے حوالے سے ہم ان مظاہر کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو معلوم ہو گا کہ ہمارا وجود اجتماعی ان اقدار سے بھی خالی ہو چکا ہے جو انسانوں کے مابین ہمیشہ مسلم رہی ہیں اور جنھیں اسلام نے اپنے شعار کے طور پر پیش کیا ہے۔ احترام انسانیت کی قدر جس پر معاشرت کی اساس قائم ہوتی ہے، ہمارے ہاں اس طرح پامال ہو رہی ہے کہ دوسروں کی عزت نفس اور ضمیر و رائے کا احترام تو ایک طرف، انسانی جان بھی اب ہمارے لیے محترم نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم محض اختلاف رائے کی بنا پر دوسرے انسان کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ عدل و انصاف کی قدر جس کی بدولت کوئی معاشرہ امن و آشتی کا گہوارہ بنتا ہے، ہمارے ہاں بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔ ہم انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطحوں پر ہر معاملے کو اغراض کے حوالے سے دیکھتے اور مفادات کی ترازو میں تولتے ہیں۔ رواداری اور صبر و برداشت کی اقدار سے انسانوں کے مابین محبتیں پروان چڑھتی اور نفرتیں ختم ہوتی ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان کے بجائے تعصب، عناد اور اشتعال ہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ احترامِ قانون کی قدر پر کسی اجتماعیت کی سلامتی کا انحصار ہوتا ہے، مگر ہمارا عام رویہ یہ ہے کہ پابندیِ قانون کو ہم اپنی توہین تصور کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم جہاں موجود ہوتے ہیں، وہاں انارکی اور بدنظمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح شرف و وقار کے تحفظ کے لیے خودداری کی قدر کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی قوم اس سے محروم ہو جائے تو اس کے لیے اقوام عالم میں مقام حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دنیا میں ایک بھکاری قوم کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ اس کی تفصیل محض یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی معاشی ضروریات کے لیے دوسروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، بلکہ علمی تحقیقات، فنی ایجادات اور تہذیبی معیارات کے لیے بھی ہم دوسروں کی نظر عنایت کے منتظر رہتے ہیں۔

یہ اخلاقی اقدار کے بارے میں ہماری غربت و جہالت کے مظاہر ہیں۔ تعلیم و تعلم کے میدان میں یہ صورت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اپنے تمام تر معانی کے ساتھ ہم پر منطبق ہو رہے ہیں۔ ہر اس شعبۂ زندگی میں جہاں تعلیم ہی کلید ترقی و بقا ہے، ہم پر پژمردگی طاری ہے۔ فلسفہ و حکمت، علم و ہنر، شعر و ادب، قانون و سیاست، فکر و فن، غرض ہر میدان میں ہمارا شمار دنیا کی پس ماندہ ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ ریاضی، کیمیا، طبیعیات، فلکیات،

سیاسیات اور اقتصادیات کے میدانوں میں ہم ان علوم کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں جن میں بعض اقوام برسوں کا سفر طے کر کے کمال فن کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ دنیوی علوم میں ہماری اس جہالت وغفلت نے ہمارے لیے مادی ترقی کے تمام راستے مسدود کر دیے ہیں، معاملہ اگر یہیں تک رہ جاتا تو پھر بھی غنیمت تھی، مگر ہم نے اس سے آگے بڑھ کر علوم دینیہ کے میدان میں بھی اسی طرز عمل کا اظہار کیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم حامل دین متین ہونے کی وجہ سے جو سرمایۂ علم واخلاق اہل دنیا کو منتقل کر سکتے اور اس طرح اقوام عالم میں باوقار مقام حاصل کر سکتے تھے، اسے کھو چکے ہیں۔قوموں کی زندگی میں تنزل وانحطاط کا یہ مقام بھی آ جاتا ہے کہ وہ ترقی کے خارجی عوامل سے بے نیاز ہو جاتی ہیں، مگر یہ صورت حال اس وقت المیہ بن جاتی ہے جب وہ اپنے اثاث البیت ہی سے غافل ہو جائیں۔ دین کے معاملے میں ہم اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔

اس غربت و جہالت کا ایک اور منظر ہمارے نظم واجتماع میں بھی نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔اجتماعی ادارے جن پر قوم کی تعمیر کا انحصار ہوتا ہے، بے علمی، بدنظمی اور بدعنوانی کے امراض میں اس قدر مبتلا ہو گئے ہیں کہ ان کی اصلاح اور ان کی بنا پر ترقی کا تصور ہی محال ہے۔سیاسی ادارے 'امرھم شوریٰ بینھم' کی اساس سے محروم ہیں۔ چنانچہ حکومت نہ مسلمانوں کی رائے سے قائم ہوتی، نہ ان کی تائید سے قائم رہتی اور نہ اس سے محروم ہو جانے کے بعد لازماً ختم ہو جاتی ہے۔اس کے نتیجے میں نہ عوام سیاسی اعتبار سے پوری طرح باشعور ہو سکے ہیں اور نہ قیادت کی چھان پھٹک کا عمل مکمل ہو سکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنے داخلی اور خارجی اہداف عمل متعین ہی نہیں کر سکے۔معاشی نظام کے حوالے سے دیکھیں تو ہم غربت وافلاس کی چکی میں مسلسل پس رہے ہیں۔اس ضمن میں یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہے کہ یہ غربت ہم پر اللہ کی آزمایش کے طور پر نہیں آئی، بلکہ ہماری اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا نتیجہ ہے۔اس میدان میں سود کے خاتمے کے نعرے تو بہت لگائے جا رہے ہیں، مگر اس بات کا ادراک کر کے کہ سود کس طرح ناسور کی طرح انسان کے وجود اجتماعی میں سرایت کیے ہوئے ہے، نہ ہم عوام میں شعوری تبدیلی لانے کے لیے سرگرم ہیں اور نہ ارباب حل وعقد کے سامنے متبادل نظام معیشت کی تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ سماجی حوالے سے دیکھیں تو ایک دوسرے کے غم بانٹنے کا طرزِ عمل بھی ہم چھوڑ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں غربت وافلاس کی انتہا اور حکومتوں کی رفاہی امور کی طرف عدم توجہی نے عام آدمی کے مسائل کو بہت بڑھا دیا ہے۔اس پر مستزاد نفسا نفسی کی فضا ہے۔اس کے نتیجے میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ قیمتی انسانی جانیں دواؤں کی امید میں سسک سسک کر ضائع ہو جاتی ہیں، مناسب بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے بچیاں اپنے گھروں سے رخصت نہیں ہو پاتیں اور ذہین نوجوانوں کو تعلیم ترک کر کے کارخانوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔شرم وحیا، ادب واحترام اور خاندانی وقار جیسی ہماری نمائندہ اقدار غیر مستحکم ہو رہی ہیں۔رفاہ عامہ کے ادارے اول تو نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ہیں، وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد اول علم و دانش نہیں، بلکہ روزگار کا حصول ہے۔تعلیمی ادارے مذہبی اور غیر مذہبی اور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اردو اور انگریزی کی غیر فطری تفریق پر مبنی ہیں۔ ان میں بھی نصابات فرسودہ، اساتذہ غیر تربیت یافتہ اور طلبہ محنت سے جی چرانے والے ہیں۔ خواتین جنھیں نئی نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے، ان کی تعلیم کو کہیں ناجائز اور کہیں غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ عدالتی نظام ایک ایسے بازار کے مانند ہے جس میں جنس انصاف مایہ دار کے لیے ارزاں اور بے مایہ کے لیے ناپید ہے۔ مذہبی اداروں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے پاس تعلیم پانے کے لیے جائیں تو تقلید کا درس ملتا ہے، تربیت حاصل کرنے کے لیے جائیں تو سمع وطاعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اگر عبادت کے لیے جائیں تو بعض اوقات فرقہ بندی کے نام پر ہدیۂ جان بھی وصول کر لیا جاتا ہے۔

ان ابتر حالات میں یہ ضروری ہے کہ کچھ اصحاب حکمت و دانش قوم میں ان مسائل کا شعور پیدا کرنے کے لیے کھڑے ہوں اور ان کے تدارک کے لیے جدوجہد کریں۔ اس ضمن میں ہمارے نزدیک حسب ذیل مقاصد کو سامنے رکھ کر لائحۂ عمل تشکیل دینا چاہیے۔

۱۔ اخلاقی اقدار کا فروغ

اول یہ کہ مسلمات اخلاق کو لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ کیا جائے اور عمل کو ان کے مطابق ڈھالنے کے لیے انھیں تربیت دی جائے۔ انھیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی نفسیات میں جینے کے بجائے دعوت کے ذریعے سے لوگوں کی اخلاقی اصلاح کو اپنا مقصد بنائیں۔ دنیا کو آزمایش گاہ جانیں اور اہل دنیا کو حق وصداقت اور دین و اخلاق کی نصیحت کرتے ہوئے ان کا ہدف آخرت میں اپنی معذرت پیش کر کے جہنم کے عذاب سے بچنا ہو۔ احترام انسانیت، حق پرستی، رواداری، عدل اور دیانت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو خود بھی اپنائیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔ تعلیم کی ترغیب

دوم یہ ہے کہ افراد قوم کے اندر طلب علم اور تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ تعلیم افراد قوم کو فعال بناتی اور اس طرح قومی تعمیر و ترقی کی راہیں کھولتی ہے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ تعلیم کا مقصد اول روزگار نہیں، بلکہ علم و دانش کا حصول ہونا چاہیے۔ لوگوں کو دینی اور دنیوی، دونوں طرح کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ وہ مادی ترقی کے لیے دنیوی تعلیم پائیں اور اخلاقی ترقی اور اخروی کامیابی کی راہیں دریافت کرنے کے لیے دینی تعلیم حاصل کریں۔

۳۔ اجتماعی امور میں رہنمائی

سوم یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی اداروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جائے۔ اس ضمن میں پہلے دو جہتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ان اداروں میں پائی جانے والی خامیوں کی نشان دہی کی جائے اور دوسرے یہ کہ ان خامیوں کی اصلاح کے لیے تجاویز مرتب کی جائیں۔ پھر عوام کے اندر اصلاح احوال کا شعور پیدا کیا جائے اور ارباب اقتدار کو پوری دردمندی کے ساتھ

مثبت تبدیلیوں کی طرف متوجہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر نظم سیاسی کے بارے میں 'امرھم شوریٰ بینھم' کے قرآنی حکم کو اساسی اصول کی حیثیت سے اختیار کرنے اور حکمرانوں کے معیار زندگی کو عام شہری کے برابر لانے پر اصرار کیا جائے۔ معیشت کے شعبے میں قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کا وسیع بندوبست قائم کیا جائے اور اس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس ہرگز عائد نہ کیا جائے۔ معاشرت کے باب میں خاندان کی اہمیت اجاگر کی جائے اور ایسا سماج تشکیل دیا جائے جس میں شرف و وقار کا معیار حشمت و اقتدار نہیں، بلکہ علم و دانش اور اخلاق و تقویٰ قرار پائے۔ تعلیم کے شعبے میں رائج تفریق ختم کر دی جائے اور نصابات کو قدامت اور تقلید سے پاک کیا جائے۔ مذہبی اداروں میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ دینی جماعتوں کا اختلاف نظر دشمنی اور عناد کی صورت نہ اختیار کرنے پائے اور مذہب کے نام پر قتل و غارت اور دہشت گردی کی فضا نہ پیدا کی جائے۔

۴۔ پس ماندگی کے خلاف جدوجہد

چہارم یہ کہ مسلمانوں میں اس بات کا شعور پیدا کیا جائے کہ وہ سائنس اور اقتصادیات کے میدان میں اپنی جدوجہد شروع کر دیں۔ موجودہ زمانے میں ترقی کے اصل میدان یہی ہیں۔ اس شعور کی بیداری کے ساتھ مسلمانوں کو اس حقیقت حال سے باخبر کیا جائے کہ ان میدانوں میں پس ماندگی کی وجہ سے وہ دنیا میں بے یار و مددگار ہیں۔ دنیا پر تسلط و بالادستی تو بہت دور کی بات ہے، وہ اپنی ریاستوں کے اندر بھی حقیقی اقتدار اعلیٰ سے محروم ہیں۔ وہ مغرب کو مفتوح کرنا چاہتے ہیں، مگر اس حقیقت کے ادراک سے عاری ہیں کہ مغرب کے تہذیب و تمدن، فکر و فلسفہ اور علم و فن نے ان کے مادی وجود کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ کو بھی مغلوب کر لیا ہے۔ ان کے اہل دانش یورپ کی زبان بولتے اور اسی کی اقدار کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، ان کے حکمران اسی کی قصیدہ خوانی کرتے اور کاسۂ گدائی لے کر اسی کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، ان کے ہنرمند اسی کے فنون کی تفہیم کو اپنی تخلیق کی معراج تصور کرتے ہیں، ان کے عوام الناس اسے جنت ارضی سمجھتے اور اس کے حصول کے لیے اپنا معاشرہ، اپنا وطن اور اپنا خاندان تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مغرب پر غلبے کا نعرہ لگاتے ہیں تو اسے زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی عارضے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مصائب میں گھرے لوگوں کی مدد

پنجم یہ کہ اپنے گرد و پیش میں موجود لوگوں کی مشکلوں اور ضرورتوں پر نگاہ رکھی جائے اور ممکن حد تک ان کی مدد کی جائے۔ کوئی بیمار ہے تو اس کے لیے دواؤں اور علاج معالجے کا بندوبست کیا جائے۔ کوئی طالب علم ضرورت مند ہے تو اس کے لیے فیس اور کتابوں کا انتظام کیا جائے۔ کسی کو بچی کی رخصتی کے لیے تعاون درکار ہے تو اس کی مدد کی جائے۔ اس ضمن میں ایسا نیٹ ورک وجود میں آنا چاہیے کہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آپس میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

_____ منظور الحسن

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org